بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیر کرم شاہ صاحب

جدید و قدیم علوم کا ایک حسین امتزاج

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ وَ اَفْضَلُ الصَّلٰوٰتِ وَ اَطْیَبُ التَّسْلِیْمَاتِ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ سَیِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدٌ الْمَبْعُوْثِ رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ وَ اَتْبَاعِہٖ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ ۔ اٰمِیْن

اَمَّا بَعْدُ۔

صدر محترم، علمائے کرام اور معزز حاضرین!

اِسلام ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جو انسان کو زندگی کی دشواریوں سے نبرد آزما ہونے، اسکے نشیب و فراز کو ہمّت سے طے کرنے اور حوادثات دہر کے سامنے سینہ سپر ہونے کے انداز سکھاتا ہے۔ غم و اندوہ کے اندھیروں میں امیدوں کے چراغ روشن کرتا ہے۔ یاس و قنوط کی اُداس فضاؤں کو تبسّم آشنا کرتا ہے۔ اِس ضابطۂ حیات کو اپنانے والے کے لئے یہ ممکن ہی نہیں رہتا کہ وہ اپنے آپ کو کشاکش زیست سے الگ کرلے۔ اسلام کے دامن میں اسے کوئی ایسا گوشۂ عافیت نہیں مل سکتا۔ جہاں وہ بیکار اور بے مقصد زندگی بسر کر سکے۔ اس کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح ثبت کر دی جاتی ہے کہ جسمانی، روحانی اور عقلی جو قوتیں اسے مرحمت کی گئی ہیں اگر اس نے ان سے پورا فائدہ نہ اٹھایا اور ان کو نیک اور بلند مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال نہ کیا تو اس سے سخت باز پرس ہو گی۔ ارشادِ ربّانی ہے۔ ان السمع والبصر والفؤاد کل اولٰئک کان عنه مسئولا۔

اسلام اپنے ہر ماننے والے کو یہی بتاتا ہے کہ سچّی عظمت اور حقیقی فلاح و کامرانی کی منزل کی طرف لے جانے والا راستہ پرخار وادیوں اور کٹھن گھاٹیوں کے درمیان سے ہو کر جاتا ہے لنھدینھم سبلنا کا مژدۂ وصال صرف انہیں کو سنایا جاتا ہے۔ جن کی زندگی وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ تو جس دین کا زندگی سے اتنا گہرا اور قریبی تعلق ہو اس کے متعلق یہ خیال کرلینا کہ وہ زندگی کے ہر لحظہ بدلتے ہوئے تقاضوں سے آنکھیں بند رکھتا ہے۔ بہت بڑی بے انصافی ہے۔ اسلام کی

روح اس مفروضہ کو تسلیم نہیں کرتی۔ تاریخ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔

ہمارے اسلاف کے علمی اور ادبی کارنامے اس امر کا زندہ ثبوت ہیں کہ انہوں نے اسلام کو کبھی زندگی سے الگ تصور نہیں کیا۔ وہ طوفانوں سے ٹکراتے والے سفینوں کا تماشا ساحل پر کھڑے ہو کر نہیں دیکھا کرتے تھے بلکہ انہوں نے ہمیشہ ہولناک طوفانوں سے پنجہ آزمائی کی اور ڈوبتے اور ڈولتے ہوئے سفینوں کا ناخدا بننے میں لذت محسوس کی اور انہیں ساحل مراد تک پہنچا کر دم لیا۔

اس عالم ہست و بود میں جس کا ہر لمحہ حشر بداماں ہے۔ چودہ صدیاں کوئی معمولی مدت نہیں، اس عرصہ میں اسلام کو مٹانے کے لئے کتنے فتنے اٹھے جنہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے ساری فضا کو مکدّر کر دیا کتنی خطرناک تحریکیں چلائی گئیں جنہوں نے دلوں کے یقین اور ذہنوں کے سکون کو درہم برہم کر دیا۔ شکوک و شبہات کی ایسی شدید آندھیاں امڈ کر آئیں کہ گمان کیا جانے لگا کہ رشد و ہدایت کی سب شمعوں کو بجھا کر ہی دم لیں گی۔ لیکن باطل کی یہ سب کوششیں رائگاں گئیں۔ اسلام کا چراغ آج بھی روشن ہے اور قیامت تک تابندہ و درخشندہ رہے گا۔ اسلام کا پرچم آج بھی لہرا رہا ہے۔ اور جبتک دنیا آباد ہے یہ لہراتا رہے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

لیکن اس کامیابی کا سہرا ان علماء ربانیین کے سر ہے جنہوں نے اپنے اپنے عہد کی ضروریات کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ جن کا ہاتھ ہمیشہ زمانہ کی نبض پر رہا اور جنکی باریک بین نظر ہمیشہ اپنے گردوپیش سے باخبر رہی۔ جنکی نگاہ احتساب سے ان کے ماحول میں اٹھنے والی کوئی لہر نہ بچ سکی۔ احادیث نبوی علی صاحبہا افضل الصلوات وازکی التسلیمات کی روایت میں جب بے اعتدالیاں ہونے لگیں۔ بے دین اور غیر ذمہ دار لوگوں کی دخل اندازی سے غلط اور ناروا باتیں ذات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کی جانے لگیں، تو علماء اسلام اس فتنۂ عظیم کے سدِّباب کے لئے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے سند کو پرکھا۔ راویوں کی ذہنی اور عملی صلاحیتوں کا جائزہ لیا۔ ان کی سیرت و کردار کو جانچا اور جہاں بھی کوئی خامی دیکھی بے دھڑک اس کی نشاندہی کر دی۔ کسی کا ظاہری تقدس، کسی کی علمی جلالت، کسی کا منصب بلند انکے نشتر تنقید سے اسے پناہ نہ دے سکا۔ ان حضرات کی بروقت اور مخلصانہ مساعی کے باعث اس فتنہ کے شعلے سرد ہوئے۔ اگر وہ حضرات وقت کے اس اہم تقاضے سے اغماض کرتے تو سنّت نبی کریم علیہ وعلیٰ آلہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کا اگر ابتہا ختریہ مٹ چکا ہوتا۔

اسی طرح عہد عبّاسی میں جب مامون الرشید اور اس جیسے علم دوست اور علم پرور خلفاء کی

سرپرستی میں یونانی فلسفہ اور یونانی علوم کو عربی میں منتقل کیا گیا تو عقائد و نظریات کی دنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اہل غرض اور مفسدہ پرداز اسلامی تعلیمات پر اعتراضات کی بوچھار کرنے لگے۔ سادہ لوح مسلمان فلسفہ کی گونج دار اصطلاحات اور بظاہر جاذب قلب ونظر دلائل سے مرعوب ہونے لگے مختصر سی مدت میں کئی فرقے، کئی گروہ نمودار ہو گئے۔ جن کا محبوب مشغلہ ملت کی ذہنی یکسانیت اور سیاسی وحدت کو پارہ پارہ کرنا تھا۔ علماء کرام نے اس ایمان سوز فتنہ کو نظرانداز نہیں کیا اور نہ ہی اس کا مطالعہ کئے بغیر اس کا رد کیا اور نہ ہی صرف فاسق و زندیق، ملحد و بے دین کے فتوے لگا کر فلسفہ یونان سے متنفر کرنے کی بھونڈی کوشش کی بلکہ پہلے خود اس فلسفہ کو پڑھا اس کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کی۔ اس کے خوب و ناخوب کو پہچانا اور اس کے بعد اس سیل خانہ بر انداز کے سامنے سد سکندری بن کر کھڑے ہو گئے۔

جدید و قدیم کی آویزش تاریخ انسانی کا ایک المناک باب ہے۔ ہر قدیم نے ہر جدید کو اپنا حریف سمجھا۔ اور اس سے ٹکرانے اور اس کو پاش پاش کرنے میں اپنی بقا کو مضمر جانا۔ اور ہر جدید نے ہر قدیم کو سنگ راہ خیال کیا اور اپنی ترقی اور نشو ونما کے لئے ضروری گردانا کہ ہر نقش کہن کو مٹا دے اور اس کی استخوانہائے شکستہ پر اپنی عظمت کا تاج محل تعمیر کرے۔ اس کشاکش میں خون کے دریا بہائے گئے۔ آبادیاں ویرانیوں میں بدل گئیں۔ کئی کتب خانے جلا کر خاکستر کر دیئے گئے۔ کتنے ماہرین کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ لیکن اسلام زمانی قیود سے بالاتر ہے۔ اس کو قدیم وجدید کی اس باہمی متعصبانہ آویزش سے کوئی سروکار نہیں۔ کسی چیز کا قدیم یا جدید ہونا اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کے نزدیک ہر چیز کا فقط یہی پہلو غور طلب ہے کہ وہ حق ہے یا باطل۔ نفع بخش ہے یا مضرت رساں۔ ہر چیز جو حق اور نفع بخش ہو اس کو وہ اپنی دستار کی زینت بنانے کے لئے تیار ہے۔ ہر وہ چیز جو باطل اور مضرت رساں ہو وہ پھینک دینے کے لائق ہے خواہ اس کے سر پر قدامت کے تقدس کا تاج زرنگار ہو یا جدت کی زرق برق خلعت فاخرہ اس نے زیب تن کر رکھی ہو۔ اور یہ سبق ان کو ان کے آقا و مولا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے دیا تھا کہ

الحکمة ضالة المؤمن اینما وجدها فھو احق بھا او کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

کہ حکمت مؤمن کی متاع گم شدہ ہے جہاں کہیں اسے یہ دستیاب ہو وہ اس کے لینے کا زیادہ حق دار ہے۔ نبی رحمت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سکھائی ہوئی یہی عالی ظرفی اور وسیع النظری تھی جس کے باعث علماء اسلام نے علم و حکمت کے موتیوں کو جہاں کہیں پایا اپنی پلکوں سے چنا اور سینوں میں محفوظ کر لیا۔ انہی علماء حق کے فیض نگاہ سے دوسری قوموں کے فرسودہ اور مردہ علوم وفنون کو نئی زندگی ملی۔

انہیں کی مشاطگی نے انہیں تازہ دلکشی اور رعنائی بخشی۔ اور مسلمان عقل و فکر کی اس شمع فروزاں کو لئے جب یورپ کے ساحل پر اترے تو یورپ کو گہری نیند سے چونکا دیا۔ اور اس کے ظلمت کدہ کو بقعۂ نور بنانے کی داغ بیل ڈالی۔ علامہ فرماتے ہیں۔

دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند　　حاصلش افرنگیاں برداشتند

انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا میں اس امر کا بڑا واضح اعتراف کیا گیا ہے۔

soon, communication with the east by trade and in the crusades and with the highly cultivated Moors in Spain, further stimulated the new burst of intellectual life. Arabic renderings of some of the works Aristatle and commentaries on them excercised a profound influence on the trend of culture, V. 7. P, 966,

جب تک مسلمانوں کا آفتاب اقبال درخشاں رہا ہر قسم کے علوم و فنون کی ترویج و اشاعت اور ان کی ارتقاء کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن اٹھارھویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں حالات نے پلٹا کھایا اور سارے عالم اسلام پر ادبار و انحطاط کے بادل منڈلانے لگے۔ مشرق میں ہندوستان کی مغلیہ سلطنت کا اقتدار روبزوال تھا تو دوسری طرف مغرب میں عثمانی خلافت کی بنیادیں لرزنے لگی تھیں۔ عرب ممالک بھی عجیب قسم کے تشتت و انتشار کا شکار ہو رہے تھے شمالی افریقہ کے اسلامی ممالک یکے بعد دیگرے یورپ کی مختلف اقوام کے حلقہ غلامی میں جکڑے جا رہے تھے۔
مغربی فاتحین نے صرف ہمارے تاج و تخت کو ہی اپنی غارتگری کا نشانہ نہیں بنایا۔ بلکہ انہوں نے اسلام سے ہمارا رشتہ توڑ دینے یا کم از کم کمزور کرنے پر اپنی ساری مساعی مرکوز کر دیں۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ ہر معاملہ میں اسلام سے سند جواز لینے کی عادی قوم کو اس طرز عمل سے ہر قیمت پر باز رکھا جائے مسلمان بھی اپنے دین کو اپنے حکمرانوں کی طرح اپنی نجی زندگی کا ایک معاملہ سمجھیں۔ ان کی اس مذموم کوشش کا محرک کیا تھا؟ یا تو وہ اسلام کے مزاج سے ناآشنا تھے اور سمجھتے تھے کہ اسلام بھی مسیحیت کی طرح زندگی کے ہر لحہ ترقی پذیر تمدنی، معاشی اور سیاسی تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔

اِس لئے بہتر یہی ہے کہ اس کا حلقۂ اثر مسجد کے احاطہ تک محدود رہے اور یا دوجہ تھی اور یہی زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ وہ اسلام سے مسلمانوں کا رشتہ کمزور کرکے اپنی حکومت کو مضبوط و پائیدار بنانا چاہتے تھے۔ وہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلمانوں کو اپنے سرچشمۂ حیات سے دور رکھ کر ہی انہیں غلامی کی ذلت پر قانع رکھا جا سکتا ہے۔ اگر اسلام سے ان کا رابطہ باقی رہنے دیا گیا تو ایک نہ ایک روز ان کا ذوقِ یقین غلامی کی ان زنجیروں کو کاٹ کر رکھ دے گا۔ اور وہ اتنا بڑا خطرہ مول لینے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے۔ ڈیڑھ صدی کا یہ عرصہ ایسا تھا کہ اسلام کو زندگی کے میدان سے جبری طور پر نکال دیا گیا۔ اس کے اثر و رسوخ کو محدود سے محدود تر کرانے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا گیا۔ غلط تعلیم و تربیت کی بھٹی میں ان کی خودی کو پگھلا کر ان کے افکار و نظریات کو اپنے انداز میں ڈھالنے کی کوششیں کی گئیں۔ اور وہ کسی حد تک بارآور بھی ثابت ہوئیں۔ ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جو اسلام کو بھی تنگِ داماں سمجھنے لگا۔ اسلام کے چند ایسے ہی خواہ بھی سرگرمِ عمل نظر آنے لگے جو اپنی کم نظری اور کوتاہ ہمتی کے باعث یہ سمجھنے لگے کہ اسلام کے تحفظ کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ اسلام کے عقائد اور اس کی تعلیمات کو اس طرح پیش کیا جائے کہ وہ کسی طرح بھی مغربی اہلِ فکر کے افکار و محققین کی تحقیقات سے متصادم نہ رہیں۔ اور اگر سعی بسیار کے باوجود چند چیزیں ایسی رہ جائیں تو انہیں کم نظر ملّاؤں کے سر تھوپ دیا جائے اور اس طرح اسلام کی جاں بخشی کرا لی جائے۔

یہ عرصہ اسلامی علوم کے لئے بڑا خطرناک تھا۔ فرنگی حکمران اہلِ علم کی حوصلہ شکنی کو اپنی استعماری مصلحتوں کا تقاضہ سمجھتے تھے۔ نوجوان طبقہ ان علوم اور ان کی درسگاہوں سے کھچا کھچا رہنے لگا تھا۔ علمائے کرام ایک طرف اغیار کے طعن و تشنیع کے تیروں کا ہدف بنے ہوئے تھے۔ تو دوسری طرف اپنوں کی بے التفاتی اور سرد مہری دل کو داغ داغ کر رہی تھی۔ بس کچھ یہ کیفیت تھی کہ

شبِ تاریک، راہ پیچ و پے یقیں رہا ہی
دلیلِ کارواں را مشکل اندر مشکل افتاد است

لیکن خدا رحمت کرے اسلام کے ان وفاکیش اور جوانمرد سپاہیوں پر جنہوں نے حالات کی سنگینی کو پرِ کاہ کی وقعت نہ دی۔ ٹوٹی ہوئی چٹائیوں پر بیٹھ کر، باسی روٹی کھا کر، پھٹے پرانے کپڑے پہن کر اسلامی علوم کی خدمت گزاری اور پاسبانی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ بادۂ وفا سے مست و سرشار جوانمردوں کو ہمارا سلام ما بر ساتید ہر کجا ہستند۔

آخر غلامی کی شبِ دیجور سحر آشنا ہوئی۔ صبح صادق کا اُجالا اداس اور تاریک فضاؤں میں نور پھیلانے لگا۔ افق پر حریت و آزادی کا آفتاب عالم تاب ابھرا۔ حضرت قائد اعظم علیہ الرحمہ کی مومنانہ فراست اور دانشمندانہ قیادت کی برکت سے برِّ صغیر کے مسلمانوں کی قربانیاں بار آور ہوئیں اور عالمِ اسلام کا سب سے بڑا ملک دنیا کے نقشہ پر نمودار ہوا۔ اب قوم آزاد تھی۔ دل اسلام کی عظمت و قوت کے معترف اور اس کی محبت سے سرشار تھے۔ اب اس صبح سعید کے طلوع ہونے کا انتظار کیا جانے لگا جب اسلام قوتِ حاکمہ کی حیثیت سے ظاہر ہوگا لیکن آئے دن حکومتیں بنتی رہیں اور بدلتی رہیں۔ اسلامی نظام کی تنفیذ کے وعدے ہوتے رہے اور ٹوٹتے رہے۔ یہ تسلسل اتنا طویل اور جاں گسل ہو گیا کہ رہ رہ کر زبان پر یہ آنے لگا۔

جو کہ دیکھا خواب تھا اور جو سنا افسانہ تھا

ہمارے طالع آزما سیاستدان تو چاہتے تھے لیکن قدرت کو یہ گوارا نہ ہوا کہ قیامِ پاکستان کے لئے بہایا جانے والا پاکیزہ شہیدوں کا خون رائگاں جائے۔ اسلام کی عظمت اور ناموس کی پاسبانی کے لئے مسلمانوں کی بے اندازہ جانی اور مالی قربانیاں ضائع ہوں۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے پر امن انقلاب کے بعد حالات نے پھر پلٹا کھایا۔ قوم کو ایک نیا عزم اور نیا ولولہ ملا۔ سوئے ہوئے جذبات نے پھر انگڑائی لی۔ جما ہوا خون رگوں میں پھر بجلی بن کر کوندنے لگا۔ توڑے ہوئے اور توڑ کر بھلائے ہوئے وعدوں کے ایفاء کے امکانات پھر روشن ہونے لگے۔

صدرِ مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ پاکستان کے قیام کا مقصد احیاءِ اسلام ہے اور قوم کو یقین دلایا کہ اس مقصد کی تکمیل ہو کر رہے گی۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ میرے نزدیک اس عظیم درسگاہ کا قیام جس کی حسین و جمیل اور پرشکوہ عمارت کے خالص علمی ماحول میں ہم سب آج جمع ہیں۔ اس وعدہ کے ایفاء کی طرف پہلا اور اہم مثبت قدم ہے۔

عِلم اجتماع کے ماہرین اچھی طرح جانتے ہیں کہ قوموں کی ترقی اور عروج میں یہ جامعات کتنا اہم اور فیصلہ کن کردار انجام دیتی ہیں۔ انہیں جامعات کے آغوش میں مستقبل کے معمار پرورش پاتے ہیں۔ انہیں فضاؤں میں انہیں اندازِ شاہینی سکھائے جاتے ہیں۔ یہاں ہی انکی سیرت ایک مخصوص قالب میں ڈھالی جاتی ہے۔ یہیں انہیں نگاہ بلند، سخن دلنواز اور جاں پرسوز کا رختِ گراں بہا بخش کر میر کارواں بنایا جاتا ہے۔ دوسری قوموں کی نشو و نما میں ان کی دانشگاہوں نے

جو حصہ لیا اور اسلامی دنیا کی مشہور و معروف جامعات نے جو خدمات جلیلہ انجام دیں وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں۔ اور ہم اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ یہ جامعہ بھی ملّتِ اسلامیہ پاکستانیہ کی وہی جلیل القدر خدمت انجام دے گا جو بغداد کے جامعہ نظامیہ، قاہرہ کے جامع ازہر، قرطبہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیوں نے انجام دیں۔

تاریخ کے اس اہم دور میں اور نازک ترین حالات میں اس جامعہ کو اس خیر الامم کی خدمت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے جو صلاحیت واستعداد کے اعتبار سے جملہ اقوامِ عالم پر فوقیت رکھتی ہے۔ لیکن جس کی صلاحیتیں مدّت سے خوابیدہ ہیں۔ جس کی استعدادیں عرصہ دراز سے کسی گرم نفس رہنما کی نظرِ التفات کی منتظر ہیں۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

بلاشبہ عصرِ حاضر میں جو جنگیں لڑی گئیں اور جو لڑی جارہی ہیں بڑی مہلک اور تباہ کن ہیں لیکن ان سے بھی زیادہ دور رس نتائج کے حامل وہ معرکے ہیں جن میں مختلف سیاسی، معاشی اور تمدنی نظریات آپس میں ٹکرارہے ہیں وہاں جو بمباری ہورہی ہے اس کے دھماکے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کے دھماکوں سے بھی زیادہ زہرہ گداز ہیں۔ تعیش وآسائش کے سامان کی فراوانی کے باوجود انسان کو آرام کا سانس نصیب نہیں۔ ہر کاخ وکو سے الغیاث الغیاث کی دلدوز صدائیں بلند ہورہی ہیں۔ دل بے چین ہیں ذہن مضطرب ہیں۔ افکار میں شعلوں کی سی سوزش ہے۔ انسانیت کا مستقبل علیٰ شفا جرف ھار کا منظر پیش کررہا ہے۔

جامعہ اسلامیہ کے سامنے اب ایک ہی سوال ہے۔ جس کا اسے جواب دینا ہے کہ قرآن کا نسخۂ کیمیا جو ملّتِ اسلامیہ کو بارگاہِ ربوبیّت سے ملا ہے کیا یہ جامعہ اس سے انسانیت کے دردوں کا درماں کرسکتا ہے۔؟ آیا وہ گم کردہ راہ اور برگشتہ قسمت مخلوق کو حضور رحمتہ للعلمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے دامنِ رحمت میں پناہ لینے پر آمادہ کرسکتا ہے۔؟ اس عظیم مقصد کی تکمیل کے لئے جتنے اور جس قسم کے کارکنوں کی ضرورت ہے کیا یہ جامعہ ان کی مناسب تعلیم وتربیت کا فریضہ ادا کرسکتا ہے۔؟

آزادی سے پیشتر ہماری ذمہ داریاں محدود تھیں، وسائل مفقود تھے۔ سرمایہ کا حصول ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ ہم مجبور تھے اس لئے معذور بھی تھے۔ لیکن آزاد ہونے کے بعد ہماری ذمہ داریوں میں صد ہا گنا اضافہ ہوگیا ہے۔ جن کو باحسن وجوہ ادا کرنا ہمارے اسلامی دارالعلوموں کا فرضِ اوّلین ہے۔ کیونکہ قوم کی ذہنی اور فکری قیادت کی زمام آج بھی انہیں کے ہاتھوں میں ہے۔ ممکن ہے اس فرض کی بجاآوری میں کسی دوسرے دارالعلوم کی فروگذاشت کو نظرانداز کردیا جائے لیکن جامعہ اسلامیہ کی فروگذاشت اور اس عظیم فرض کی ادائیگی میں کوتاہی ناقابلِ عفو ہوگی، جسے نہ خدا معاف کرے گا اور نہ تاریخ معاف کرے گی۔ کیونکہ اسے حکومتِ پاکستان، خصوصاً صدر پاکستان کی خصوصی سرپرستی حاصل ہے۔

اس کے پاس اتنے وسائل ہیں جن کا دوسرے دارالعلوم تصور بھی نہیں کرسکتے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ دین رب العالمین کی طرف سے رحمتہ العلمین صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین ہے۔ اور یہ زمان و مکان کی حدود و قیود سے بالاتر ہے تو پھر ہم اس دین قیّم کو عالمی اور آفاقی دین بنانے کے لئے موثر اور مناسب کوشش کیوں نہیں کرتے۔ شرق و غرب میں جو طاغوتی قوتیں اسلام کو زندگی کے تمدنی، معاشی، سیاسی، اخلاقی غرضیکہ ہر میدان میں للکار رہی ہیں ان سے نبرد آزما ہونے کے لئے ہم کوئی جامع پروگرام کیوں مرتب نہیں کرتے۔ کیا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے آنکھیں بند رکھیں تو خطرہ ٹل جائے گا؟ یورپ کا مادیت زدہ اور اشتراکیت کا ملحدانہ فلسفہ ہمارے نوجوانوں کے اذہان کو اس سے کہیں زیادہ پریشان اور ان کے ایمانوں کو کہیں زیادہ مضمحل کر رہا ہے جس پریشانی اور اضمحلال کا تجربہ عباسی دور میں یونانی فلسفہ کی یلغار کے وقت ہوا تھا۔ ہم اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے موجودہ فلسفہ میں مہارت حاصل کرنے کے بعد اس کے بخیے کیوں نہیں اُدھیڑ دیتے۔ معاشیات و سیاسیات کے متصادم نظریات نے انسانیت کے مستقبل کو تباہی اور مکمل بربادی کے کنارے لا کھڑا کیا۔ کیا ہمارا فرض اولین نہیں کہ ہم اسلامی، معاشی اور سیاسی نظریات سے دنیا کو آگاہ کریں۔ آج صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ اسلام کا معاشی نظام، عدل و انصاف اور اسلام کا سیاسی نظام انسانی شرف و مساوات پر مبنی ہے بلکہ ہمیں ان کے جملہ نظریات سے تقابل کرکے دکھانا ہوگا۔ محض سا تقابل نہیں بلکہ تفصیلی تقابل اور تجزیہ۔ تاکہ کسی منکر کے لئے مجالِ انکار باقی نہ رہے۔ لیکن اس تقابل کے لئے ان کے نظریات کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ ادھورا اور نا تمام مطالعہ نہیں بلکہ گہرا اور عمیق مطالعہ، تاکہ آپ کا قول ان کے علوم میں ان کے لئے بھی قولِ فیصل ہو جس طرح آپ کے اسلاف کرام کا قول، قولِ فیصل ہوا کرتا تھا۔ یہ تب ہی ہوسکتا ہے کہ علوم کے متعلق ہم تعصب اور تنگ نظری کی روش ترک کریں، اپنے طلبہ کو، اپنے مستقبل کے مبلغوں کو، نظر و فکر کے معرکوں میں توحید کا پرچم لہرانے کی ذمہ داری قبول کرنے والوں کو ہم ان تمام علوم سے آشنا کردیں۔ انہیں بتادیں کہ یہ وہ امراض ہیں، جنہوں نے انسانیت کو جاں بلب کر دیا ہے۔ تم نے ان کا درماں کرنا ہے۔ جاہلیت و بربریت کے عفریت ان خوفناک ہتھیاروں سے مسلح ہیں جن کو تم نے نیچا دکھانا ہے۔

اے عزیز طلبہ! باطل سے ٹکرا کر اسے پاش پاش کرنے کے لئے صرف اتنا کافی نہیں کہ آپ علم کے بحر بیکراں بن جائیں۔ کیونکہ علم کے زور سے آپ مقالے لکھ سکتے ہیں، کتابیں تالیف کرسکتے ہیں۔ مناظرہ میں آپ اپنے مدمقابل کو شکست دے سکتے ہیں لیکن کسی شقی کو سعید، کسی گمراہ کو ہدایت یافتہ نہیں بنا سکتے۔ علم کے زور سے آپ ذہنوں کو مرعوب کرسکتے ہیں لیکن دلوں کی کائنات کو نہیں بدل سکتے۔ جدید و قدیم علوم میں جامعیت پیدا کرنے کے باوجود آپ ھم قوم لا یشقی جلیسھم کا مصداق نہیں ہو سکتے۔ اس مقام تک رسائی حاصل کرنے کے لئے آپ کو

صحیح اسلامی تربیت اور تہذیب نفس کی ضرورت ہے اس درسگاہ کے ارباب لبست وکشاد کو جس طرح آپکی علمی ترقی کو ہر وقت پیش نظر رکھنا ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا ہے کہ کیا ان کے طلبہ میں صدیق وفاروق کی پاکیزہ زندگی کی تابانی بھی نمایاں ہورہی ہے۔کیا ان میں بھی نانِ جویں اور فطرت اسداللہی میں مستحکم رابطہ پیدا ہورہا ہے۔

یہ امر بڑا مسرت بخش ہے کہ دوسری یونیورسٹیاں ہمارے جامعہ اسلامیہ کی ڈگریوں کو تسلیم کررہی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ خیال آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ صرف ڈگریاں حاصل کرنے کا شوق اور ان ڈگریوں کے بل بوتے پر بڑے بڑے منصب حاصل کرنے کی رغبت اس درسگاہ میں آپ کے داخل ہونے کا سبب بن جائے۔

یہ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمت کا شرف ہرکس وناکس کو نہیں بخشتا۔جو دین کو حصول دنیا کا ذریعہ بناتے ہیں وہ اس کی نگاہ لطف وعنایت سے محروم کردیئے جاتے ہیں۔محبوبِ حقیقی بڑا غیور ہے وہ کسی کی شراکت کو پسند نہیں کرتا بلکہ یوں کہیئے کہ وہ برداشت ہی نہیں کرتا۔آپ بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کرکے بھی خلوص وایثار کے جذبہ سے سرشار ہوسکتے ہیں۔خدا کرے ایسا ہی ہو۔

اے اس عظیم درسگاہ کے اولین فرزندو! اے ہماری امیدوں کے دمکتے ہوئے ستارو! اگر تمہارے ذہن میں خدمت دین کا کوئی مقام ہے۔اگر تم اس کی عظمت ورفعت کے سامنے شوکت جمشید وجاہ فریدوں کو ہیچ سمجھتے ہو اگر نبی رؤف ورحیم صلی اللہ علیہ وسلم کے مصلی کو تم تخت طاؤس سے زیادہ پرشکوہ جانتے ہو تو سن لو! تمہیں اسی راہ پر چلنا ہوگا جس پر اسلام کے اولین مبلّغ چلے تھے۔اور اگر تمہارے دل میں ان چیزوں کی قدر ومنزلت نہیں یا ان کے سوا کسی اور چیز میں فخر ولذت محسوس کرتے ہو تو کس ناداں نے آپکو مشورہ دیا کہ عشاق باصفا کی راہ پر چلو۔ پہلے سینے میں بلال کا دل پیدا کرو پھر اللہ اکبر کی صدائے جاں پرور بلند کرو۔کربلا کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے اپنے آپ کو صبرِ حسین علیہ السلام سے آراستہ کرلو۔ایسا نہ ہو کہ باطل کے مظالم کی تاب نہ لاکر وہاں سے بھاگ نکلو اور اپنے ساتھ حق اور اہل حق کو بھی شرمسار کرو۔یہاں تو ایک کی رضا کی خاطر سب کو ناراض کرنا پڑتا ہے۔یہاں تو ایک کو پالینے کے لئے سب کچھ چھوڑنا بلکہ لٹانا پڑتا ہے اور اسے راضی کرکے، اُسے پاکر یہ کہنا پڑتا ہے ؎

اذا کنت عنی یا منی القلب راضیا
اری کل من فی الکون لی یتبسم

بلاشبہ یہ راستہ بڑا دشوار ہے۔یہ منزل بڑی دُور ہے اور بڑی جانکاہیوں کی طلبگار ہے۔لیکن اولو العزم لوگ کسی راستے کو اس لئے تو اختیار نہیں کرتے کہ یہ آسان اور ہموار ہے اور کسی راہ سے اس لئے تو منہ نہیں موڑتے۔کہ یہ مشکل ہے اور پُرخار ہے۔بلکہ ان کے پیش نظر تو منزل مقصود ہوا کرتی ہے۔اور اس کی کشش ان کو کشاں کشاں لئے جاتی

ہے۔ وہ اس امر کی پرواہ ہی نہیں کرتے اور انہیں ان امور کی پرواہ کرنے کی فرصت ہوتی ہی کہاں ہے کہ ان کا دامن کن جھاڑیوں سے اُلجھ کر تار تار ہو رہا ہے۔ اُن کے پاؤں کن چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر لہو لہان ہو رہے ہیں۔ وہ طارق بن زیاد کی طرح یہی اعلان کرتے ہوئے بڑھتے جاتے ہیں۔

ولسنا نبالی کیف سالت نفوسنا
اذا نحن ادرکنا الذی کان اجدرا

اللہ تعالے اپنے محبوب مکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے طفیل اولوالعزم ہستیوں کے جادہ تسلیم ورضا پر صبر و شکیب کے ساتھ چلنے کی توفیق مرحمت فرماوے اور ہمیں اس منزل سے دُور نہ کرے جو اہلِ حق کی قبلہ گاہ ہے۔ آمین ثم آمین

ایاک نعبد وایاک نستعین اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین۔ آمین ثم آمین

وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین

الٰہی بخش جار اللہ

جدید و قدیم علوم کا ایک حسین امتزاج

فکرِ اسلامی کی روشنی میں جامعہ کا قیام اور اُسکا نصب العین

جامعہ اسلامیہ کی اساس مسجد نبوی کی درسگاہ صفہ اور تاریخ اسلامی کے وہ دار العلوم ہیں جنہوں نے حوادث دہر کے علی الرغم ہر دور میں علم و ہدایت کی شمع کو فروزاں رکھا۔ جن کے فارغ التحصیل بوریا نشینوں نے دنیا کو علم و حکمت سے مالا مال کر دیا۔ شرق و غرب جن کی درسگاہوں سے علم و فضل کی بھیک مانگنا فخر سمجھتے تھے۔ جو زمانہ کی ہر ادا کے نباض اور اس کے ہر انداز کے شناسا تھے۔ جنکے عزم و استقلال اور شان فقر و استغناء نے زمانہ کو اپنی روش بدلنے پر مجبور کر دیا۔ ہمیں انہیں کے نقشِ قدم کی تلاش ہے اور ہم تجسس و تحقیق کی وہی راہیں پھر زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم قدیم و جدید کی موجودہ تفریق کو یکسر پسِ پشت ڈال کر انہیں ذی شان ہستیوں کی طرح ایکبار پھر علم کو محض علم کے لئے اور مقصدِ زیست بنا کر حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہم حقیقت و صداقت کی وہ ازلی رفعتیں پا سکیں۔ جن سے ذات عز اسمہٗ نے ان کے قلوب کو منور فرمایا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ علوم فی ذاتہا سب کے سب قدیم اور ازلی ہیں۔ جدید محض ان کی تعبیرات ہیں۔ جو ہر زمانہ میں بدل کر جدا جدا پیرائے اختیار کرتی رہی ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ فی ذاتہٖ علم مضر نہیں ہوتا بلکہ یہ تعبیر و تفصیل اور اس کا طریق استعمال ہوتا ہے۔ جو اُسے مضر بنا دیتا ہے۔ اس لئے علوم خواہ دنیوی ہوں یا دینی محمود و مقصود ہی نہیں بلکہ وہ موہبت رحمانی ہیں۔[1] اور ان سے انسانی تخلیق اور استخلاف آدم کا منشاء پورا ہوتا ہے[2]

ہمارے اسلاف نے دینی و دنیوی علوم و معارف میں بلا امتیاز وہ مقام حاصل کیا جو ان سے پہلے کی اور ان کے بعد کی کسی قوم کو نصیب نہ ہو سکا۔ اس صفحۂ ہستی پر شاید وہ پہلی ہی قوم

---

(۱) کیونکہ اصولِ علوم اور قوانینِ فنون و صناعت ابتدائے آفرینش ہی سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو بذریعہ الہام و القا تعلیم فرمائے تھے۔ (ملاحظہ ہو روح المعانی جلد اول، تحت آیت وعلم آدم الاسماء کلہا)

(۲) ملاحظہ ہو تفسیر بیضاوی و تفسیر مظہری بحوالہ ابن عربی۔

ہے۔ جس نے نظامِ تعلیم کے اندر قدیم و جدید علوم کی اصطلاح کا اضافہ کیا۔ اور ان میں باہم حسین امتزاج کی راہ پیدا کی۔ ہمارے نظامِ تعلیم میں قدیم و جدید کا لفظ بھی اسی اصطلاح سے ماخوذ ہے۔ اگرچہ آج جب ہمارے ہاں قدیم علوم کا لفظ بولا جاتا ہے۔ تو اس سے علوم اسلامیہ یا اگر زیادہ وسعت مقصود ہو تو یونانی، آریائی و سامی اقوام کے ادبیات عالیہ مراد ہوتے ہیں، اور علوم جدیدہ کے لفظ سے موجودہ دور کے سائنسی علوم، جغرافیہ، تاریخ و دیگر سوشل سائنسز مراد ہوتی ہیں۔ لیکن اسلامی نظامِ تعلیم کی تاریخ میں علوم قدیمہ سے ——— جیسا کہ شارٹر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مصنف نے لکھا ہے ——— منطق، فلسفہ، حساب، جیومٹری، علم نجوم، موسیقی، طب اور کیمیا وغیرہ مراد لیئے جاتے تھے۔ اور علوم اسلامیہ کو علوم جدیدہ سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ علامہ ابن خلدون نے بھی اپنی تاریخ کے مقدمہ میں قدیم و جدید کی اصطلاح سے کام لیا ہے۔ مگر بعض اوقات وہ علوم کی اس تقسیم کو علوم طبیعیہ اور علوم نقلیہ سے معنون کرتا ہے۔ بعض حضرات نے اس تقسیم کو علوم عقلیہ اور علوم نقلیہ کا عنوان دیا ہے۔ امام غزالی نے اپنی کتاب احیاء علوم الدین میں ان قسمین کو علوم آلیہ اور علوم اصلیہ سے تعبیر کیا ہے۔ اور بعض نے مقاصد و وسائل کا نام دیا ہے۔ یہ تعبیر اوّلاً اسلیئے ہے کہ اصل مقصود علوم شرعیہ ہیں اور علوم عقلیہ ان کی حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ایک وسیلہ اور ذریعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے علوم محمودہ کی اور علوم مذمومہ کی اصطلاح جیسے امام غزالی نے اور دیگر محققین اسلام نے ذکر کیا ہے۔ واضح ہو جائے گی۔ کہ علوم کی تمام وہ تعبیرات جن سے علوم اصلیہ کے حصول میں یا انسانی مقصدِ زیست پر عمل پیرا ہونے میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے وہ سب مذموم ہیں اور ان سے علماء و صلحاء ہر دور میں بیزار رہے ہیں۔ اسی لئے زیات اپنی کتاب۔ تاریخ ادب العربیہ میں ناول نگاری کے متعلق لکھتا ہے۔

"لیکن مسلمانوں نے اس کی طرف (ناول نگاری) کوئی توجہ نہ کی تھی۔ اسلیئے کہ
جو فن دین میں مفیدنہ ہو اس سے وہ بے اعتنائی برتتے ہیں"

ثانیاً اس لیئے کہ علوم اسلامیہ شرعیہ مقصود زیست ہیں اور علوم عقلیہ، طبیعیہ وسیلۂ زیست۔

بہرحال گذشتہ دورِ غلامی تک ہر زمانہ میں مسلمانوں کا نصابِ تعلیم علوم قدیمہ و جدیدہ کا سنگم رہا۔ شارٹر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مصنف نے مسلمانوں کے نظام مدارس پر بحث کرتے ہوئے۔ دو قسم کے نصاب ذکر کئے ہیں جو اسلامی ممالک میں رائج تھے۔ ان میں ایک قسم کا نصاب مندرجہ ذیل عناصر پر مشتمل تھا۔

علوم نقلیہ ، علوم لسانیہ ، علوم عقلیہ ، علوم طبیعیہ ، حکمت عملیہ۔

علوم نقلیہ میں قرآن ۔ تجوید و قراءات سبعہ۔ تفسیر مع ناسخ و منسوخ و دیگر متعلقہ علوم، حدیث مع متعلقہ علوم، فقہ ، اصول فقہ، فرائض ، طبقات ، علم الکلام ، تصوّف ، تعبیر الرؤیا و دیگر علوم شامل تھے۔

علوم لسانیہ میں چار علوم زیادہ مشہور تھے۔ نحو مع تصریف - لغت - معانی، بیان، بدیع - اور ادب و عروض۔

علوم عقلیہ : منطق - البحث والنظر - ریاضی (حساب - الجبرا - جیومٹری) ہندسہ (انجینرنگ وغیرہ) پر مشتمل تھے۔

علوم طبیعیہ میں عمومی طور پر یہ علوم شامل تھے۔ علم طب ، فلسفہ ، الٰہیات (مابعد الطبیعیات) طبیعیات و عنصریات - حیاتیات (بیالوجی) علم الحیوانات (زوولاجی)۔ تشریح الابدان تشریح الافلاک یا فلکیات ، علم نجوم ، علم النباتات ، ( ) معدنیات - وغیرہ وغیرہ۔ حکمت عملیہ میں سیاست مدن یعنی پولیٹیکل سائنس ، پولیٹیکل اکانومی تدبیر منزلی (ہوم اکنامکس) اور جغرافیہ و تاریخ بھی فی الحقیقت اسی کا حصہ تھے اور اسی سبب سے مسلمانوں نے ان علوم کو مدون کیا تھا۔

دوسرے قسم کا نصاب تعلیم دو عناصر پر مشتمل تھا۔ مقاصد اور آلات و وسائل "مقاصد" میں یہ علوم شامل تھے۔ قرآن ، تجوید - تفسیر تمام متعلقہ علوم کے ساتھ - حدیث ذیلی علوم کے ساتھ - تصوّف فقہ و اصول فقہ و فرائض ۔ ان کے علاوہ دیگر تمام علوم "وسائل" میں شامل تھے۔

پروفیسر گب نے یہ تصریح نہیں کی کہ ان مضامین میں انتخاب و اختیار کی کس حد تک گنجائش تھی یا طلبہ کو تمام مضامین پڑھنا لازم تھے۔ لیکن اس کی مقاصد و وسائل کی تقسیم سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ کہ مقاصد کا پڑھنا بہرحال لازمی تھا - ابن خلدون اور امام غزالی کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دینیات کو نصاب کا مرکزی مقام حاصل تھا - دیگر علوم کے مبادیات ایک درجہ تک پڑھا دیئے جاتے تھے ، مزید تعلیم کے لئے طالب علم اپنے رجحان کے مطابق علوم کا انتخاب کر لیتا تھا۔

پاک و ہند میں اوچ کے مدرسہ فیروزیہ و دیگر مدارس چار دانگ عالم میں شہرت رکھتے مگر ان میں زیر تدریس نصاب تعلیم کی تفصیلات میسّر نہیں آ سکیں۔ ہندوستان میں فتح اللہ شیرازی سے قبل مروجہ نصاب کے یہ عناصر تھے۔ نحو ، ادب ، منطق ، فقہ ، اصول فقہ ، تفسیر ، حدیث ، تصوّف ، کلام - محمد تغلق کو عقلی علوم سے دلچسپی تھی - جس کے سبب لوگوں میں